The Influence of Balochi Culture on Atta Shad's Urdu Ghazal

عطاشاد کی اردو غزل پر بلوچی ثقافت کے اثرات

Maryam Anwar *[1]
PhD Scholar, Department of Urdu ,GCU Faisalabad.
Dr.Saima Iqbal*[2]
Assistant Professor, Department of Urdu, GCU Faisalabad

مریم انور☆[1]
پی ایچ ڈی سکالر، شعبہ اردو، جی سی یونیورسٹی، فیصل آباد
ڈاکٹر صائمہ اقبال☆[2]
اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اُردو، جی سی یونیورسٹی، فیصل آباد

Correspondance:**saimaiqbal@gcuf.edu.pk**

eISSN:**3005-3757**
pISSN: **3005-3765**

Received: 15-04-2026
Accepted:28-06-2026
Online:28-06-2026

Copyright:© 2026 by the authors. This is an access-openarticle distributed under the terms and conditions of the Creative Common Attribution (CC BY) license

ABSTRACT: Balochistan's distinctive geographical and cultural narrative emerges as a vibrant and dynamic communicative element within the classical and contemporary traditions of the Urdu ghazal. The region's magnificent historical journey, its vast expanses of desert and mountain, and tribal values such as fidelity to bonds, adherence to one's word, honor, hospitality, and self-respect impart a sense of solidity and dignity to the ghazal's inward-looking nature. Allusions, myths, and local romantic legends drawn from Balochi and Brahui language and literature have infused the ghazal's sensory frameworks with indigenous color and universal vitality. By integrating metaphors of Balochistan's scorching rocks, rugged valleys, and the nomadic wanderings of the wilderness into the ghazal's traditional system of symbolism and allusion, a new intellectual and aesthetic dimension has been bestowed upon the delicate sensibilities of the classical ghazal.

KEYWORDS: Urdu Ghazal, Balochistan Culture, Balochi & Brahui Literature, Cultural Metaphors & Allusions, Classical &

ثقافت کیا ہے ؟ فرہنگ کارواں کے مطابق ''ثقافت کے معنی فنون لطیفہ، علم و ادب، تمدن اور کسی قوم کے تصور حیات موجود ہے۔''(۱) اس تعریف سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ ثقافت کسی ایک گروہ کی حدود معین نہیں کر سکتی کیوں کہ تصور حیات کا لفظ کسی ملت کی مشترکہ شناخت کی اساس ہے جو اس معاشرے کے تمام افراد میں موجود ہوتی ہے۔ ثقافت کی تخلیق اور منتقلی ایک اجتماعی عمل کا حاصل ہے نہ کہ چند طاقتوروں کی جانب سے عطا کردہ تحفہ ہے۔ فلپ بگ بی نے ثقافت کی تعریف کچھ یوں کی ہے

> ''ثقافت کسی اجتماع کے بیشتر افراد کے ان متواتر رویوں کا نام ہے جو اپنی اصل کے اعتبار سے نسلی اور جبلی نہیں ہوتے بلکہ کسی اجتماع نے خاص ماحول میں مخصوص عقائد و افکار اور دوسرے اثرات کے تحت اپنے اندر پیدا کر لیے ہوتے ہیں اور ان میں یک رنگی پیدا ہو جاتی ہے۔''(۲)

یہاں ثقافت کسی خاص گروہ سے تعلق رکھنے والے افراد کے وہ متواتر رویوں کا نام ہے۔ یہ رویے نسلی یا جبلی بنیادوں پر استوار ہونے کے بجائے اکتسابی ہوتے ہیں۔ یعنی اُس گروہ کے افراد انھیں اپنے ماحول، روایات اور عقائد و افکار سے متاثر ہو کر اپناتے ہیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ ان کے رویوں میں اتنی یک رنگی پیدا ہو جاتی ہے۔ جو بعد ازاں اس گروپ کی انفرادیت اور شناخت کو عیاں کرتی ہے۔

بلوچستان جس کا تسمیہ بلوچوں کے مسکن پر ہے۔ جغرافیائی و رقباتی اعتبار سے پاکستان کی سب سے وسیع مگر انتہائی کم آبادی والی اکائی ہے۔ متناسقی لحاظ سے یہ علاقہ ۵۴-۲۴ سے ۴-۳۲ شمالی عرض البلد اور ۵۶-۶ سے ۷-۱۵ مشرقی طول البلد کے درمیان محصور ہے، جس کی علاقائی حدود مشرق میں سندھ، مغرب میں ایران، شمال میں افغانستان اور جنوب میں بحیرہ عرب کے ساحل سے جا ملتی ہیں۔ ۱۳۴،۰۰۲ مربع میل کے موجودہ رقبے پر پھیلا یہ صوبہ مساحت کے اعتبار سے پنجاب، سندھ اور سابقہ نوابی ریاستوں (خیر پور و بہاولپور) کے مجموعی رقبے کے برابر ہے۔

بلوچ قوم کا تاریخی اور ارتقائی سفر ان کی ہزاروں برسوں کی تاریخ کی روشنی میں بحر خزر سے لے کر موجودہ بلوچستان میں آباد ہونے تک ایک ایسا دردناک المیہ ہے، جہاں قدم قدم پر اسے اپنی زندگی کی حفاظت کے لیے بیرونی حملہ آوروں، وقت کے جابر بادشاہوں اور حکمرانوں سے ایسی خون آشام جنگیں لڑنی پڑیں جن کے تصور سے بھی رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں لیکن اپنی بقا کے اس سفر میں اس نے مصلحت اور مفاہمت کی راہ اختیار کرنے کی بجائے ہمیشہ حالات کا مردانہ وار مقابلہ

کیا۔ بحر خزر سے ایران اور ایران سے بلوچستان تک مختلف ادوار میں مختلف نقل مکانیوں کا سلسلہ بلوچ قوم کی تاریخ کی ایک طویل داستان ہے۔

> "قدیم بلوچ معاشرہ ایک ایسے تہذیبی ورثے کا مالک ہے جہاں زندگی کے تمام تر تہذیبی اصول، روایات و اقدار اسی معاشرہ کی کوکھ سے جنم لیتے ہیں۔ یہاں روایتوں اور سماجی اقدار کی پاسداری اور پابندی کسی شاہی فرمان و حکم یا دھونس اور جبر کے حوالے سے نہیں کی جاسکتی بلکہ اس معاشرہ کا ہر فرد اپنے کردار و عمل کے حوالے سے روایت و اقدار کا خالق بھی ہے اور اس کا امین بھی۔"(۳)

قدیم بلوچ سماج ایک ایسے ماحول اور معاشرہ کی داستان ہے، جہاں زندگی کے اصول و ضوابط، روایات، اقدار اور رسوم و رواج کی نگہبانی و پاسبانی ایک ایسا قرض ہے جسے چکائے بغیر کوئی بھی فرد یا گروہ اس معاشرہ میں زندہ رہنے کا تصور نہیں کر سکتا کیونکہ اس معاشرہ میں رہنے کے لئے ضروری ہے کہ ہر ایک ان روایات و اقدار کی نہ صرف پاسبانی کرے بلکہ اس معیار پر پورا اترنے کے لیے خود کو اس کا اہل بھی ثابت کرے، جس پر اس معاشرہ کی تہذیبی اور سماجی عمارت استوار ہے۔ وگرنہ اسے اس معاشرہ میں رہنے کا کوئی حق نہیں۔

بلوچستان کا خصوصی جغرافیائی و تہذیبی بیانیہ اردو غزل کی کلاسیکی و معاصر روایت میں ایک جاندار اور متحرک ابلاغی عنصر کے طور پر نمایاں ہوتا ہے۔ اس خطے کا شاندار تاریخی سفر، صحرائی و کوہستانی وسعتیں اور قبائلی اقدار مثلاً پاس، قول، غیرت، میزبانی اور خودداری اردو غزل کی داخلیت کو ایک صلابت اور وقار بخشتی ہیں۔ بلوچی اور براہوئی زبان و ادب کے تلمیحات، اساطیر اور مقامی رومانوی داستانوں نے غزل کے حسیاتی سانچوں کو دیسی رنگ اور آفاقی توانائی فراہم کی ہے۔ غزل کے روایتی ایمائیت و اشاریت کے نظام میں بلوچستان کی تپتی چٹانوں، سنگلاخ وادیوں، اور بادیہ گردی کے استعاروں نے شامل ہو کر کلاسیکی غزل کے نازک احساس کو ایک نیا فکری اور جمالیاتی تناظر عطا کیا ہے۔

تہذیبی تو اخذ اور بین الثقافتی اثرات کے تحت بلوچستان کی ثقافتی جڑوں نے جدید اردو غزل کی موضوعاتی اقلیم اور لغوی سرمائے کو وسعت بخشی ہے۔ اس اختلاط کے نتیجے میں اردو غزل محض لکھنو و دہلی کی شہری وضع داری یا محض دلی جذبات کی ترجمان نہیں رہی، بلکہ اس میں بلوچستان کے عوامی استقامت، سیاسی و سماجی شعور اور محرومی کے باوجود پائے جانے والے افتخار کی گونج صاف سنائی دیتی ہے۔ بلوچ ثقافتی زندگی کے مظاہر، مقامی علائم اور لوک روایت کی آمیزش سے غزل کے اسلوب میں بیانیے کی سادگی، لہجے کی کھردراہٹ اور صدق و صراحت کا ایک نادر توازن پیدا ہوا ہے۔ یوں بلوچستان کی ثقافتی اور اسلوبیاتی جہات نے اردو غزل کو ایک نئی آفاقیت، جغرافیائی تنوع اور معنوی گہرائی سے ہمکنار کیا ہے۔

جدید بلوچی شاعری میں عطا شاد کی اپنی انفرادیت ہے۔ وہ روایت پرست نہیں، روایت شکن ہیں۔ غزل ہو، نظم ہو، شاعری ہو (جس کے بلوچی کے بانی بھی)خود ہیں۔ وہ ہم عصر شعراء سے یکسر ممتاز مختلف ہیں۔ ان کے کلام میں معنی آفرینی، بلند خیالی، حسن بیان اور شوکت لفظی، نازک خیالی اور اپنا ذخیرہ لفظی بلالتزام ملتا ہے۔ ندرت خیال وجدت بیان کے باوجود غیر مانوسیت کا شائبہ تک نہیں ہوتا۔ سننے یا پڑھنے والا الفاظ کے حسن انتخاب کے ظلم میں کھو کر رہ جاتا ہے۔ قوم پرستی کے اس دور میں تقریباسب ہی شعراء کے ہاں مشترکہ موضوع ہے۔ عطا شاد کے کلام میں آفاقی تصورات کے بوجھ تلے دبی ہوئی ہے۔ وہ غلامی کی مخالفت جغرافیائی یا علاقائی تناظر میں نہیں کرتے بلکہ اسے اعلیٰ انسانی اقدار سے انحراف قرار دے کر اس کی تذلیل کرتے ہیں۔ عطا شاد کا شعر سلوگن نہیں کہ وقت گزرنے پر اس کی اہمیت بر قرار نہ رہ سکے بلکہ وقت گزرنے کے ساتھ اس کے شعری عظمت میں اور نکھار آتا ہے۔ اس کی معنویت دعوت فکر دیتی ہے۔

عطا شاد کی شاعری بالخصوص ان کا اردو کلیات "اب جب نیند ورق الٹے گی" بلوچستان کے جغرافیے، ثقافت اور حسیاتی ماحول کا خوبصورت مرقع ہے۔ عطا شاد نے اردو غزل کے روایت پسند مزاج میں بلوچستانی منظر نامے، کوہساروں، پیاس، چٹانوں، صحرا، اور مقامی علامات کو شامل کر کے اردو شاعری کو ایک نیا نکھار دیا۔

کوہساروں کی عطا رسم نہیں خاموشی
رات سو جائے تو بہتا ہوا چشمہ بولے(۴)

بلوچی ثقافت اور بلوچستان کا ماحول بنیادی طور پر کوہساروں اور وادیوں پر مشتمل ہے۔ پہاڑ بلوچ زندگی میں صرف صحرا یا چٹان کا نام نہیں، بلکہ یہ وقار، پناہ گاہ اور تاریخی روایات کے امین ہیں۔ عطا شاد اس شعر میں کوہساروں کو خاموش اور جامد وجود کے طور پر تسلیم کرنے سے انکار کرتے ہیں۔ بلوچ معاشرت میں سکوت کا مطلب موت نہیں بلکہ ایک ایسا تحفظ اور صبر ہے جس کے بطن سے نئی زندگی اور آواز جنم لیتی ہے۔ کوہساروں کی خاموشی دراصل ان کی ہیبت اور خودداری کی علامت ہے، مگر جب رات کی تاریکی اور تنہائی چھاتی ہے، تو قدرت کے مخفی مظاہر سامنے آتے ہیں۔

بلوچستان میں پانی اور چشمے جیوتی اور ثقافتی مرکزیت رکھتے ہیں۔ کیریز اور قدرتی چشمے یہاں کی بود و باش اور بقا کا سہارا ہیں۔ عطا شاد فرماتے ہیں کہ جب رات کو ساری کائنات سو جاتی ہے اور ظاہری شور و غل تھم جاتا ہے تو پہاڑوں کے سینے سے پھوٹتا ہوا چشمہ بولنے لگتا ہے۔ یہ چشمے کا بولنا بلوچی لوک روایات اور زندگی کی علامت ہے۔ شاعر نے اردو غزل کی روایتی عاشقانہ فضا کے بجائے بلوچستان کے قدرتی ماحول، رات کے سکوت میں چشموں کی نغمہ خوانی اور کوہساری جلال و جمال کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے، جو براہ راست بلوچ ثقافت کی نمائندگی کرتا ہے۔

پیاس چٹکیاں لیتی ہے پیاسے ساحل پر
کوئی سمندر موج کی چادر تان کے سوئے(۵)

بلوچستان کا ساحلی خطہ (مکران اور گوادر وغیرہ) جغرافیائی اعتبار سے شدید تضاد کا حامل ہے۔ ایک طرف بے پناہ سمندر اور پانی کا ذخیرہ ہے تو دوسری طرف ساحل اور ساحلی علاقوں کے لوگ پینے کے صاف پانی کی بوند بوند کو ترستے ہیں۔ بلوچی ثقافت اور تاریخ میں پیاس صرف ایک جسمانی ضرورت نہیں بلکہ محرومی، صبر اور سخت کوشی کا استعارہ بھی ہے۔ عطاشاد نے پیاس چٹکیاں لیتی ہے، کا استعارہ استعمال کر کے اس تلخ حقیقت کو بیانی ساخت عطا کی ہے جو مکران اور ساحلی بلوچستان کی ثقافتی و معاشی زندگی کا عکس ہے۔

اس شعر کا دوسرا مصرع سمندر کی بے حسی اور قدرت یا وقت کے ظالمانہ رویے کی نشاندہی کرتا ہے۔ موج کی چادر تان کے سونا ایک ایسا اچھوتا اور صدماتی امپریشن پیدا کرتا ہے جس میں سمندر بے خبر اور غافل پڑا ہے جبکہ ساحل پیاس کی شدت سے تڑپ رہا ہے۔ بلوچ ثقافت میں مہمان نوازی اور سخاوت کو بنیادی قدر سمجھا جاتا ہے، اس تناظر میں سمندر کا اپنے پاس پانی ہوتے ہوئے بھی ساحل کو پیاسا رکھنا ایک ثقافتی المیہ بن جاتا ہے۔ عطاشاد نے مقامی جغرافیے کی اس کشمکش کو غزل کے شایانِ شان لبادے کو شامل کر کے اردو شاعری میں ایک نئی جہت کا اضافہ کیا ہے۔

برف کے شعلوں سے ہے سوجھا ہوا ہر اک بدن
دھوپ کی چادر بچھا، میرے کوہستان میں(۶)

یہ شعر بلوچستان کے کوہستانی اور پہاڑی علاقوں کے شدید اور سنگلاخ موسم سرما کی عکاسی کرتا ہے۔ بلوچستان کا موسم سرما نہایت سخت اور جان لیوا ہوتا ہے جہاں برف باری اور منفی درجہ حرارت زندگی کی حرارت کو مفلوج کر دیتا ہے۔ عطا نے برف کے شعلے کی حیرت انگیز اور متضاد ترکیب استعمال کی ہے۔ شدید سردی میں جب جلد سن ہو جاتی ہے تو برف بھی آگ کی طرح جلتی ہوئی محسوس ہوتی ہے اور جسم سوج جاتے ہیں۔ یہ کیفیات بلوچ کوہساروں میں رہنے والوں کی روزمرہ زندگی کا حصہ ہیں۔ شعر کے دوسرے مصرعے میں بلوچ لینڈ سکیپ اور ثقافت کی ایک اور دلکش علامت دھوپ کی چادر ظاہر ہوتی ہے۔ بلوچستان میں سخت سردیوں کے بعد دھوپ صرف روشنی نہیں، بلکہ زندگی، گرمجوشی اور پناہ کی علامت بن جاتی ہے۔ شاعر اپنے محبوب، قدرت، یا حاکم وقت سے التجا کرتا ہے کہ اس کے یخ بستہ کوہستان پر رحم کر کے سورج کی حرارت یعنی دھوپ کی چادر بچھا دے۔ اردو غزل میں روایتی طور پر وصل کی تمنا زلف یا آغوش سے جوڑی جاتی ہے، مگر عطاشاد بلوچ

ماحول کے تناظر میں دھوپ اور کوہستان کا استعارہ لا کر غزل کو اپنے وطن کے موسموں اور ثقافتی ضروریات سے جوڑ دیتے ہیں۔

پھر سنگسار کرنے کی تم نے ٹھانی ہے
میرے کوہساروں سے تم کو پتھر ملیں گے (۷)

بلوچستان کو چٹانوں، سخت جان پہاڑوں اور پتھریلی زمین کا خطہ کہا جاتا ہے۔ بلوچ ثقافت میں چٹان اور پتھر نہ صرف جغرافیائی حقیقت ہیں بلکہ استقامت، مردانگی، اور پائیداری کا نشان بھی ہیں۔ اس شعر میں شاعر اپنے دشمنوں یا مخالفین کو ایک غیر متزلزل بلوچ آن کے ساتھ چیلنج کرتا ہے۔ سنگسار کرنا یعنی پتھروں سے مارنا خود ایک قدیم تاریخی اور ثقافتی سزا یا ردعمل ہے، لیکن شاعر اپنے مخالفین کی اس دھمکی کا جواب نہایت بے باکی اور خوداعتمادی سے دیتا ہے۔

شاعر کا یہ کہنا کہ میرے کوہساروں سے تم کو پتھر ملیں گے بلوچ زمین سے شاعر کے لازوال رشتے کو ظاہر کرتا ہے۔ یعنی اگر تم مجھے ہی تباہ کرنے کے لیے پتھر تلاش کر رہے ہو، تو میرے اپنے وطن کے پہاڑ تمھیں وہ ہتھیار فراہم کریں گے، اور میں اپنی ہی زمین کے پتھروں سے شہید ہونے پر فخر محسوس کروں گا۔ اس شعر میں بلوچ شجاعت، دھرتی سے محبت اور کسی بھی مصیبت کا مسکراتے ہوئے سامنا کرنے کی ثقافتی روایت کو غزل کے رنگ میں ڈھالا گیا ہے۔

پیاس کا دشت تھا، صحرا کا سفر تھا سائیں
ہم نے سائے کو بھی سایہ نہ سمجھا سائیں (۸)

بلوچستان کا ایک بڑا حصہ وسیع و عریض صحراؤں پر مشتمل ہے جہاں دشت و صحرا کی وسعت اور پیاس مسافروں کا امتحان لیتی ہے۔ بلوچ قبائلی اور بدوی زندگی میں صحرانوری، طویل سفر اور کٹھن حالات برداشت کرنا ثقافتی اخلاقیات کا حصہ ہے۔ اس شعر میں پیاس کا دشت اور صحرا کا سفر محض لفظی تصویر کشی نہیں بلکہ بلوچ قوم کی تاریخی جد و جہد اور سخت کوشی کا استعارہ ہے۔ سائیں کا لفظ صوفیانہ اور مقامی عقیدت و احترام کو ظاہر کرتا ہے جو اس علاقے کی شائستہ گفتگو کا انفرادیت بخش جزو ہے۔

سایہ صحرا کے سفر میں سب سے قیمتی نعمت ہوتا ہے، لیکن بلوچ ثقافت کی غیرت، خودداری اور سفر کی لگن کا تقاضا یہ ہے کہ مسافر ستائے بغیر اپنے مقصد کی طرف بڑھتا رہے۔ سائے کو بھی سایہ نہ سمجھنا اس بات کی علامت ہے کہ بلوچ مسافر نے

عارضی آسائشوں، سہولتوں اور پناہ گاہوں کو ٹھکرا کر اپنے کٹھن راستے کو جاری رکھا۔ عطا شاد نے صحرائی زندگی کی اس سختی اور بے نیازی کو اردو غزل میں یوں سمویا ہے کہ غزل کا بنیادی حزن بلوچ صحرا کے جلال میں بدل جاتا ہے۔

سنگ زادوں کی زباں بھی تو سمجھ کر دیکھو
کوئی پتھر بھی تو بولے گا صدا کی صورت(۹)

سنگ زاد کی ترکیب عطا شاد کی شاعری کی ایک مشہور اور بنیادی علامت ہے۔ یہ ترکیب براہ راست بلوچ عوام اور پہاڑی خطوں کے باشعور، غیرت مند اور سخت کوش انسانوں کے لیے استعمال ہوتی ہے۔ بلوچ ثقافت میں کوہستان کی گود میں پلنے والے انسانوں کو بیرونی دنیا اکثر خاموش، جاہل یا سخت دل سمجھنے کی غلطی کرتی ہے۔ شاعر تمام ناقدین اور دنیا والوں سے التجا کرتا ہے کہ وہ پہاڑوں کے ان بیٹوں کی بولی، ان کے احساسات اور ان کے اندر چھپی تہذیب و غم کو سمجھنے کی کوشش کریں۔

شعر کے دوسرے حصے میں شاعر ایک معجزاتی اور پر امید کیفیت بیان کرتا ہے کہ اگر تم محبت اور فہم و فراست سے سنو گے تو تمھیں محسوس ہو گا کہ یہ بظاہر جامد اور خاموش پتھر بھی کسی گونج دار صدا کی طرح بول اٹھتے ہیں۔ بلوچ لوک داستانوں میں پہاڑوں کی گونج اور صداؤں کی ایک خاص اہمیت ہے جہاں داستان گو پہاڑوں کی صدا میں اپنے اسلاف کی تاریخ سنتے ہیں۔ عطا شاد نے بلوچ تاریخ اور جغرافیے کے اس ثقافتی عنصر کو غزل کی لطافت کے ساتھ پیش کیا ہے۔

پانیوں کا کہیں نام و نشاں نہیں عطا
اور ہم بادلوں کو بلاوا بھیجتے ہیں(۱۰)

بلوچستان خشک سالی اور پانی کی شدید قلت کا شکار خطہ رہا ہے۔ بارش کا انتظار بلوچ ثقافتی، معاشی اور جذباتی زندگی کا سب سے اہم محور ہے۔ جب بارش نہیں ہوتی تو ندی نالے خشک ہو جاتے ہیں اور زندگی مفلوج ہونے لگتی ہے۔ ایسے میں بادلوں کی آمد کی دعائیں مانگنا، لوک گیت گانا اور بادلوں کو خوش آمدید کہنا بلوچی کلچر اور لوک روایات کا حصہ بن چکا ہے۔ عطا شاد اس شعر میں دھرتی کی خشک سالی اور پانی کی عدم دستیابی کے دکھ کا اظہار کر رہے ہیں۔

بادلوں کو بلاوا بھیجنا ایک نہایت خوبصورت اور مقامی ثقافتی اسلوب ہے۔ یہ دھرتی کا آسمان سے رشتہ اور بلوچ کسان و چرواہے کا قدرتی مظاہر سے مکالمہ ظاہر کرتا ہے۔ پانی کی عدم موجودگی کے باوجود امید کا دامن نہ چھوڑنا اور بادلوں کو بلانا

بلوچ قوم کی ہمت اور لازوال امید کی علامت ہے۔ عطا شاد نے اس شعر میں بلوچی کلچر کے اس احساس رجائیت اور زمین و آسمان کے تعلق کو اردو غزل کا موضوع بنایا ہے۔

ہوا کا دشت تھا، تنہائیوں کا جنگل تھا
ہم اپنے گھر سے نکلتے تو اور کہاں جاتے (۱۱)

یہ شعر بلوچستان کے تنہا، کھلے اور بظاہر ویران جغرافیائی ماحول کا مکمل احاطہ کرتا ہے۔ بلوچستان میں آبادی بکھری ہوئی ہے اور ایک بستی سے دوسری بستی کا فاصلہ میلوں پر محیط دشت و صحرا اور سناٹے پر مشتمل ہے۔ اس کٹھن جغرافیے کے باعث بلوچ زندگی میں تنہائی، کھلی ہوا کا دشت اور طویل مسافتیں فطری طور پر شامل ہو جاتی ہیں۔ عطا شاد اس شعر میں مسافر بلوچ کی اس مجبوری اور قسمت کا ذکر کرتے ہیں جو جب بھی اپنے گھر یا بستی کی حد سے نکلتا ہے تو اس کے سامنے بلا کا سناٹا اور پھیلاؤ ہوتا ہے۔

شعر کا دوسرا مصرعہ بلوچ فطرت کے اس جبری اور تلاشی سفر کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ جب ہجرت یا سفر مقدر بن جائے تو انسان کے پاس اس ماحول کو قبول کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہوتا۔ ہوا کا دشت اور تنہائیوں کا جنگل جیسی تراکیب اردو غزل کی روایتی نغمگی میں بلوچ صحراؤں کے تیز جھونکوں اور سناٹوں کی آواز شامل کرتی ہیں۔ عطا شاد کی شاعری میں یہ مقام بلوچ ثقافت کے المیے اور مسافرانہ روح کا ترجمان ہے۔

ہم کہ کوہساروں کی سرد چھاؤں کے پالے
کب تک تیرے صحرا کی تپش میں جلے ہوں گے (۱۲)

بلوچستان میں جغرافیائی اور موسمیاتی فرق پایا جاتا ہے ایک طرف سرد اور اونچے کوہسار ہیں تو دوسری طرف شدید تپتے ہوئے صحرا اور میدانی علاقے ہیں۔ اس شعر میں عطا شاد نے کوہساروں کی سرد چھاؤں اور صحرا کی تپش کا تقابل کر کے بلوچ وجود کی نفسیاتی و ثقافتی کیفیت بیان کی ہے۔ پہاڑ پر بسنے والے بلوچ افراد کی پرورش ٹھنڈی، پروقار اور پرسکون ہواؤں میں ہوتی ہے، اسی لیے ان کا مزاج اور غیرت کوہساری جلال کا عکس ہوتی ہے۔

شعر کا دوسرا مصرعہ اس جبر اور ناانصافی کے خلاف احتجاج ہے جہاں ایک شاداب اور پروقار کوہساری وجود کو مجبوراً صحرا کی بے رحم تپش میں جلنا پڑتا ہے۔ یہ شعر بلوچ قوم کی اپنی سرزمین کے پہاڑی وقار اور موجودہ دور کی تلخ حقیقتوں و معاشی /

سیاسی تپش کے درمیان کشمکش کی نمائندگی کرتا ہے۔ عطا شاد اردو غزل کے فریم ورک کے اندر بلوچ پہاڑی خصوصیات کی حسیت کامیابی کے ساتھ منتقل کرتے ہیں۔

شب کے سناٹے میں جب کوئی نہیں بولتا
کوئی پتھر میرے کوہسار کا روتا ہو گا[۱۳]

بلوچ ثقافت اور شاعری میں حزن و ملال اور نوحہ گری کی ایک خاص جگہ ہے۔ تاریخی طور پر جنگوں، ہجرتوں اور محرومیوں نے بلوچ مزاج میں ایک گہرا اور باوقار غم داخل کر دیا ہے۔ عطا شاد اس شعر میں شب کے سناٹے اور کوہساروں کے پتھروں کے روئے کو تجسیم کا درجہ دیتے ہیں۔ بلوچ داستانوں میں بھی پہاڑ اور چٹانیں اپنے سپوتوں کی قربانیوں پر اداس ہوتی دکھائی دیتی ہیں۔

شاعر کا یہ تصور کہ کوئی پتھر میرے کوہسار کا روتا ہو گا بلوچ لینڈ سکیپ کے ساتھ شاعرانہ اور صوفیانہ یگانگت کو ظاہر کرتا ہے۔ جب کائنات کے تمام انسان سو جاتے ہیں یا ناانصافی و ناگفتہ بہ حالات پر خاموش رہتے ہیں، تو یہ بلوچ دھرتی کے پتھر ہی ہیں جو رات کی تنہائی میں اپنے بچوں کے غم میں آنسو بہاتے ہیں۔ عطا شاد نے اس شعر میں بلوچی کلچر کی لازوال حزنیت اور وطن پرستی کو اردو غزل میں لازوال بنا دیا ہے۔

عطا شاد کے ان تمام منتخب اشعار سے ثابت ہوتا ہے کہ انہوں نے کلیات "اب جب نیند ورق الٹے گی" میں اردو غزل کے اندر بلوچ ثقافت، کوہسار، سنگ و خشت، پیاس، صحرا اور مقامی لفظیات کو سمو کر ایک ایسی تخلیقی روح پھونکی ہے جو اردو ادب میں بلوچ کلچر کی سب سے توانا اور معتبر آواز ہے۔

حوالہ جات

1۔ فضل الٰہی عارف، فرہنگ کارواں، لاہور: مکتبہ کارواں، 1962ء، ص234

2۔ ایس ایم یوسف، ڈاکٹر، اسلامک کلچر (انگریزی)، لاہور: انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک کلچر، 1978ء، ص:7

3۔ واحد بزدار، قدیم بلوچی شاعری کا تنقیدی جائزہ، اسلام آباد: قومی ادارہ برائے مطالعہ پاکستان، ۱۹۹۸ء، ص ۱۷

4۔ عطا شاد، اب جب نیند ورق الٹے گی (شعری کلیات)، کوئٹہ: فیصل بکس، ۲۰۱۲ء، ص ۲۳

5۔ ایضاً، ص ۳۱

6۔ ایضاً، ص ۴۵

7۔ ایضاً، ص ۵۲

8۔ ایضاً، ص ۶۰

9۔ ایضاً، ص ۷۴

10۔ ایضاً، ص ۸۸

11۔ ایضاً، ص ۱۰۵

12۔ ایضاً، ص ۱۱۸

13۔ ایضاً، ص ۱۳۲

Reference:

.1 Fazal-ul-Ilahi Arif, Farhang-e-Karwan, Lahore: Maktaba Karwan, 1962, p. 234

.2 S. M. Yusuf, Dr., Islamic Culture (English), Lahore: Institute of Islamic Culture, 1978

.3 Wahid Buzdar, Qadeem Balochi Shayari Ka Tanqeedi Jaiza, Islamabad: Qaumi Idara Baraye Mutalia Pakistan, 1998, p. 17

.4 Ata Shad, Ab Jab Neend Waraq Ulte Gi (Poetry Collection), Quetta: Faisal Books, 2012, p. 23

.5 Ibid, p. 31

.6 Ibid, p. 45

.7 Ibid, p. 52

.8 Ibid, p. 60

.9 Ibid, p. 74

.10 Ibid, p. 88

.11 Ibid, p. 105

.12 Ibid, p. 118

.13 Ibid, p. 132